واضح کریں کہ ارشاداتِ نبوی کی موجودگی میں حضرت ابن مسعودؓ کے قول کی کیا صحیح توجیہ ہو سکتی ہے ؟

جواب : لفظ ذکر کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی دل میں اللہ کو یاد کرنے یا یاد رکھنے کے ہیں۔ دوسرے معنی اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں طرح طرح سے اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں، مثلاً موقع بموقع الحمدللہ، ماشاء اللہ، انشاء اللہ، سبحان اللہ وغیرہ کہنا، بات بات میں کسی نہ کسی طریقے سے اللہ کا نام لینا، رات دن کے مختلف احوال میں اللہ سے دُعا مانگنا، اور اپنی گفتگوؤں میں اللہ کی نعمتوں اور حکمتوں اور اس کی صفات اور اس کے احکام وغیرہ کا ذکر کرنا۔ تیسرے معنی قرآن مجید اور شریعت الٰہیہ کی تعلیمات بیان کرنے کے ہیں، خواہ وہ درس کی شکل میں ہوں، یا باہم مذاکرہ کی شکل میں، یا وعظ و تقریر کی شکل میں۔ چوتھے معنی تسبیح و تہلیل و تکبیر کے ہیں۔ جن احادیث میں ذکرِ الٰہی کے حلقوں اور مجلسوں پر حضورؐ کے اظہارِ تحسین کا ذکر آیا ہے اُن سے مراد تیسری قسم کے حلقے ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جس چیز پر اظہارِ ناراضی کیا ہے اس سے مراد چوتھی قسم کا حلقہ ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حلقے بنا کر تسبیح و تہلیل کا ذکرِ جہری کرنا رائج نہ تھا۔ نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی اور نہ صحابہ نے یہ طریقہ کبھی اختیار کیا۔ رہا پہلے دو معنوں میں ذکرِ الٰہی، تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے حلقے بنا کر ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ لازماً انفرادی ذکر ہی ہو سکتا ہے۔ (ا-م)

وَالنَّجم کی ابتدائی آیات کی تاویل

سوال : قرآن کی سورۂ نجم کی آیت ثم دنیٰ فتدلّیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں بالعموم دنیٰ فتدلّیٰ کا فاعل جبریلؑ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ صحیح بخاری شریف کی حدیث معراج میں ہے :

حتیٰ جاء سدرۃ المنتہیٰ دنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتیٰ کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ (یہاں تک کہ حضور علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو رب العزۃ جل جلالہ حضور علیہ السلام کے قریب ہوتے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور زیادہ قرب حاصل کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام سے دو کمانوں کی مقدار یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا)۔

اس کی شرح میں علامہ عینی اور علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا جمال مبارک سر اقدس کی آنکھوں سے دیکھا۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رأیت ربی عز وجل فی احسن صورۃ (میں نے اپنے رب کو بہت اچھی صورت میں دیکھا) اور پھر کان قاب قوسین او ادنیٰ کے آگے ہے فاوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ جو صریح دلیل ہے اس بات کی کہ فکان قاب قوسین میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے، ورنہ حضور علیہ السلام جبریل کے بندے قرار پاتے ہیں (معاذ اللہ)

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بخاری کی اس صحیح اور واضح حدیث کے بعد اس آیت کی دوسری تاویل کیسے درست ہو سکتی ہے جس میں جبریل کا دیکھا جانا اور قریب ہونا مراد لیا جاتا ہے اور اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی یعنی ذاتِ الٰہی کو دیکھا ہے اور بالکل قریب ہو کر دیکھا ہے؟

جواب: سورۂ والنجم بالخصوص اس کا پہلا رکوع قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ایک ہے۔ اس میں بیشتر آیات ایسی ہیں جو متشابہات کی قبیل سے ہیں اور جن کی صحیح تاویل اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم علمائے راسخین نے اپنے اپنے فہم اور بصیرت کی حد تک ان کے مطالب بیان کیے ہیں۔

اس سورۃ کے بارے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول کیا ہے اور عَلَّمَہٗ شدید القویٰ، نیز آیات مابعد میں جو عظیم الشان واقعہ یا سلسلۂ واقعات بیان ہوا ہے

وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ کس دور میں پیش آیا ہے؟ سورۂ نجم کو بالعموم مکی عہد کی ابتدائی نازل شدہ سورتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے بخاری اور دیگر صحاح میں ایسی احادیث مروی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی وہ پہلی سورت ہے جس کی آخری آیت کے ذریعہ سے سجدۂ تلاوت کا آغاز ہوا ہے۔ اب اگر پوری سورت مکی دور کے ابتداء میں نازل ہوئی ہے تو اس کا پہلا رکوع اس واقعۂ معراج سے کیسے متعلق ہو سکتا ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہے؟ مستند ترین احادیث کی رُو سے یہ معراج ہجرت سے صرف ایک یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی ہے۔

اس اشکال کو مختلف پیرایوں میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اسراء کا واقعہ متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔ بعض نے فرمایا ہے کہ سورۃ کا ابتدائی حصّہ مکی عہد کے اوائل میں نازل ہوا ہے اور بعد کا حصّہ اواخر میں، یا دوسرے لفظوں میں وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی میں جس واقعے کا ذکر ہے وہ معراج سے پہلے کا ہے اور وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی اور اس سے آگے جو کچھ بیان ہوا ہے وہ لیلۃ الاسراء میں پیش آیا ہے۔ اس ضمن میں بعض روایات سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی حراء یا ابطح یا دوسرے کسی مقام پر وہ کیفیت پیش آئی تھی جو دنیٰ فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں مذکور ہے۔ مگر ان جملہ اقوال و تاویلات کے باوجود وہ پیچیدگی پوُرے طور پر رفع نہیں ہوتی جو معراج کے مشہور واقعہ پر سورۂ والنجم کے کسی حصے کو بھی چسپاں کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ محتاط اور صائب موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے کسی جزو کا تعلق معراج کے ساتھ نہ جوڑا جائے اور اس کے پہلے رکوع میں جو کچھ بیان ہوا ہے اُسے اس سلسلۂ تربیت و تعلیم کی اہم کڑیوں میں شمار کیا جائے، جس میں سے آنحضورؐ کو آغازِ نبوت میں گزارا گیا تھا۔ اس تادیب و تربیت کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے اندر وحی کے اخذ و تحمل کی قوت پیدا ہو جائے اور ملاءِ اعلیٰ اور جبریل امین سے آپ کی موانست و مناسبت قائم ہو

جائے۔ قرآن و حدیث میں اس سلسلے کے دیگر متعدد واقعات مذکور ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔
تاہم شانِ نزول کی بحث سے قطع نظر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس سورۃ کا تعلق واقعۂ معراج سے ہے، تب بھی دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس کی ابتدائی آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ معلّم کون تھا، اُفقِ اعلیٰ پر کون تھا، کون کس سے قریب ہوا، کون جھکا، کس نے وحی کی ------- اور کس نے کس کو دوبارہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس نزول کرتے دیکھا؟ سلف میں سے بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ ذات باری اور ذاتِ نبوی کے مابین پیش آیا ہے۔ ان کے نزدیک الافق الاعلیٰ پر اللہ خود مستوی ہوا، اللہ اپنے نبی سے قریب ہو گیا یا نبی اللہ سے قریب ہو گیا اور قرب سے مراد قرب مکانی نہیں بلکہ قربتِ معنوی ہے۔ ان حضرات کی تاویل کے مطابق مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى .... عِندَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں جس رویت کا ذکر ہے اس سے مراد آنحضورؐ کا رویتِ باری سے مشرف ہونا ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ رویت مادی آنکھوں سے ہے یا فقط قلب و فؤاد کی رؤیت ہے، نیز یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ یہ دیدار عین ذاتِ الٰہی کا ہے یا انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کا ہے۔
اس قول کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بخاری شریف کی بھی حدیث مذکور ہے۔ لیکن اس حدیث سے استدلال اشکالات سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلے میں سورۃ والنجم کی متعلقہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اس حدیث پر انحصار کرنا قرینِ صحت نہیں ہے۔
سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت جس میں دنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتّٰی کان منہ قاب قوسین ... کے الفاظ مروی ہیں اور جسے امام بخاری کتاب التوحید، باب کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً میں مفصل لاتے ہیں، اس کا سلسلۂ اسناد حضرت انس پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے ابواب میں معراج کے متعلق مرفوع احادیث موجود ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انسؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہیں، مگر ان میں سورۃ النجم کے یہ الفاظ اس تشریح کے ساتھ وارد نہیں ہیں اور یہ روایت کئی پہلوؤں سے ان احادیثِ مرفوعہ سے متعارض ہے۔

دوسری قابل ذکر بات اس روایت کے بارے میں یہ ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن پر محدثین نے روایت و درایت کے اعتبار سے متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ اس کے اسناد میں ایک راوی شریک بن عبداللہ ہیں جن پر بعض محدثین نے شدید جرح کی ہے اور وہ جرح شروح بخاری میں منقول ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے (کتاب الایمان، باب المعراج) میں شریک کی اس روایت کی سند بیان کرنے کے بعد اس کے متن کا صرف ایک ابتدائی فقرہ بیان کرکے چھوڑ دیا ہے اور پھر اس راوی کے متعلق تنبیہ و تنقید کے ان الفاظ کو اپنی جانب سے ثبت کرنا ضروری سمجھا ہے: فقدم فیه شیئًا واخّر وزاد ونقص (راوی نے اس روایت میں متن کے کچھ الفاظ کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور بڑھا گھٹا دیا ہے)۔ بخاری اور مسلم دونوں کی کتاب التفسیر اس روایت سے خالی ہے۔

اس حدیث کے متن اور مضمون پر درایۃً بھی بعض معارضات عائد کیے گئے ہیں۔ امام خطابی نے اس پر جن الفاظ میں تنقید کی ہے، اسے فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دنا الجبار رب العزۃ فتدلّی ... کی تاویل میں ممکن اشکالات اور ان کے جوابات کو امام خطابی کی زبانی علامہ ابن حجرؒ نے مفصل بیان کیا ہے۔ امام خطّابی نے اور خود ابنِ حجر نے اعتراضات یوں دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک رؤیا تھا جس میں دنو، تدلّی اور نزول کی کیفیات، اللہ تعالیٰ کے باب میں مستبعد اور موجبِ قباحت نہیں، لیکن دنا الجبار رب العزۃ فتدلّی کے الفاظ کی روشنی میں ساری آیات کی ایک ایسی تعبیر اور ذات باری سے متعلق ایسی تشبیہ و تصویر لازم آتی ہے جس کا وقوع عالم لامکان اور حالتِ رویاء میں بھی اشکال و اعتراض سے بالکل بری نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریک کی اس روایت میں اور بھی بہت سے پہلو محلِ نظر ہیں، جن کا یہاں بیان کرنا غیر ضروری اور باعثِ طوالت ہے۔ خود حافظ ابنِ حجر نے گیارہ یا اس سے زاید اعتراضات گنوائے ہیں اور ان کے دفعیے کی پوری سعی کی ہے، لیکن بعض جوابات پوری طرح

تشفی بخش نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس روایت کا آغاز یوں ہے : لیلۃ اُسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ انہ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحیٰ الیہ ۔ گویا کہ یہاں آنحضورؐ کے جس اسراء کا ذکر ہے وہ ابتدائے وحی سے پہلے کا واقعہ ہے، اور متصلاً آگے جو عبارت متن میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسجد حرام میں خوابیدہ تھے کہ تین فرشتے آئے اور ایک نے کہا کہ ان سونے والوں میں سے آپ کونسے ہیں۔ دوسرے کی نشاندہی پر تیسرے نے کہا کہ آپ کو لے چلو۔ اس رات اور کوئی واردات پیش نہیں آئی حتّٰی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فرشتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ مزید واقعات جو حدیث میں آگے بیان ہیں وہ کسی دوسری رات میں رونما ہوئے۔ اب فقط تین فرشتوں کی آمد کو اسراء کا نام دینا اور پھر اسے قبل وحی کا واقعہ قرار دینا ایک ایسی گتھی ہے جسے سلجھا لینا آسان نہیں ہے۔ امام ابن حجر اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فرماتے ہیں : لعلہ اراد ان یقول بعد ان اوحی الیہ فقال قبل ان یوحی الیہ (ممکن ہے کہ راوی یہ کہنا چاہتے ہوں کہ وحی کے بعد ایسا ہوا مگر کہہ یہ گئے ہوں کہ وحی سے پہلے ہوا۔)

بہر کیف ایک طرف یہ روایت ہے اور دوسری طرف بخاری و مسلم کے دیگر ابواب، بالخصوص بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النجم میں بہت سی احادیث ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قربت و رویت کا ذکر سورۂ نجم میں ہے، اس میں فریقین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام ہیں۔ امام بخاری کا والنجم کی تفسیر میں ان احادیث کو لانا اور شریک والی روایت کو نہ لانا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا ذاتی رجحان یہی ہے کہ والنجم میں فریق ثانی جبریل ہیں نہ کہ باری تعالیٰ۔ مثلاً باب فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں وہ حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت لائے ہیں: انہ رأی جبریل لہ ستمائۃ جناح ۔ یہ روایت مسلم، کتاب الایمان، باب رآہ نزلۃ اخری وھل رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربّہٗ لیلۃ الاسراء میں بھی موجود ہے اسی باب میں ذرا آگے حضرت عائشہؓ کی روایت مسروق سے موجود ہے جس میں وہ فرماتی ہیں: تین باتیں ہیں جن میں سے ایک بھی کوئی کہے تو وہ اللہ پر بڑا افتراء کرے گا۔ راوی نے کہا، وہ کیا؟ حضرت عائشہ نے کہا

جس نے یہ دعویٰ کیا کہ محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا، اس نے اللہ پر افترا باندھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں ٹیک لگائے تھا، پس میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے کہا: اے ام المومنین! ٹھیریئے، جلدی نہ کیجیے، کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ولقد راٰہ نزلۃ اخرٰی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے اس امت میں سب سے پہلے ان آیات کے متعلق آنحضورؐ سے پوچھا تھا، آپ نے فرمایا کہ "وہ تو جبریلؑ ہے۔ میں نے اُسے اس کی پیدائشی صورت میں انہی دونوں مواقع پر دیکھا ہے..." پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا، کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ... وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ يُكَلِّمَهٗ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا... اس حدیث میں جو کچھ حضرت عائشہؓ نے اپنی طرف سے فرمایا ہے، اس میں اختلاف ہو یا نہ ہو لیکن جو کچھ آپ نے آنحضرتؐ سے نقل فرمایا ہے اس کی حیثیت حدیثِ مرفوع کی ہے، اس میں قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے اور اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آیات والنجم میں آنحضورؐ کے علاوہ جس دوسری ہستی کا ذکر ہے، اس سے مراد جبریلؑ امین ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ یا عینیؒ کا یہ قول کہیں ان کی شرح میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضورؐ نے معراج میں یا دوسرے کسی موقع پر مادی آنکھوں سے اللہ کو دیکھا ہے، بلکہ اس کے خلاف اقوال موجود ہیں۔ ابن حجرؒ، کتاب التفسیر، باب قولہ اوحی الی عبدہ... میں اسی قول کو اوضح فی المراد کہتے ہیں کہ آنحضورؐ نے جسے دیکھا وہ جبریلؑ ہیں۔ کتاب التوحید میں بھی انہوں نے امام مالک اور امام احمد کے اقوال نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فانی دنیا میں اللہ کی رویت عینی ممکن نہیں ہے۔ رأیت ربی فی احسن صورۃ... والی حدیث کی پوری عبارت سے واضح ہے کہ اس میں جس رویت کا ذکر ہے وہ حالتِ منام کی ہے، اس لیے اسے مادی آنکھوں کی رویت سمجھنا صحیح نہیں۔ یہ حدیث احمد اور ترمذی کے حوالے سے مشکوٰۃ، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ میں درج ہے اور وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض دیگر روایات میں رویت باری کا ذکر ملتا ہے، لیکن ان میں بھی یہ تصریح نہیں ملی کہ آنحضورؐ نے ذات باری کو بچشم سر دیکھا ہے۔